جذبہ

05-02-2017

فہرست

بچوں کی دنیا

انوکھی سزا ۱
آخری گولی ۲
بہادر لڑکا ۴
بھوت ۵
ترقی ۶
تین دوست ۷
سیدھا راستہ ۹

انوکھی سزا

مصنف: حاجی بصیر سراج

''حسن بیٹا، دوکان سے ایک کلو چینی جلدی سے لے آؤ'' حسن کی امی نے حسن کو دیکھ کر بلند آواز سے کہا۔ حسن اس وقت کھیل کر گھر میں داخل ہورہا تھا۔

''جی امی! ابھی جاتا ہوں'' حسن نے جواب دیا، اور گھر سے کچھ ہی دور موجود دوکان کی طرف چل پڑا، دوکان پر پہنچ کر حسن نے ایک کلو چینی کا آرڈر دیا۔

دوکاندار حسن کی بات سن کر مڑا اور دوکان کے اندرونی حصے کی طرف چینی لینے کے لئے چلا گیا، اسی دوران حسن کی نگاہ دوکان میں سامنے ریکنگ پر رکھے ایک ڈبہ پر پڑی جو رنگ برنگے کیکوں سے بھرا پڑا تھا، حسن اس وقت بھوکا تھا، اسکے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا اس نے دوکاندار کو اپنی طرف متوجہ نہ پاکر جلدی سے ایک کیک اٹھایا اور منہ میں ڈال کر نگلنے کی کوشش کرنے لگا، اسی دوران دوکاندار واپس آگیا، اور حسن کو چینی دی، حسن نے چینی لے کر رقم ادا کی، اور گھر کی طرف چل پڑا۔

حسن دل ہی دل میں بہت خوش تھاکہ دوکاندار اسکی چوری کو نہیں دیکھ سکا، اور کیک مفت میں اس نے کھا لیا، کیک کا ذائقہ حسن کو بہت اچھا لگا، لیکن اسے محسوس ہورہا تھا کہ جب سے اس نے کیک کھایا ہے اسکے گلے میں کوئی چیز پھنس سی گئی ہے۔

حسن گھر پہنچا، ماں کو چینی تھمائی اور ایک کمرے میں موجود آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا، حسن نے اپنا منہ کھولا اور آئینے کی مدد سے گلے میں جھانکنے لگا، کہ وہ کون سی چیز ہے جو اس کے گلے میں پھنس گئی ہے، اور اب تو درد بھی ہونے لگا تھا۔ حسن زور لگا کر پورا منہ کھولنے کی ناکام کوشش کرتارہا، مگر اسے کوئی چیز نظر نہیں آئی۔

ابھی حسن آئینے کے سامنے کھڑے منہ کھولے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک حسن کی امی کمرے میں داخل ہوئیں اور حسن کو یوں منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر حیران ہوئیں، اور پوچھا، حسن بیٹا اس طرح منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔

حسن اپنی امی کو سامنے دیکھ کر گھبر اگیا، اور بولا، نہیں امی، بس ویسے ہی کھڑا ہوں۔

ابھی حسن نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے گلے میں ایسا شدید درد ہوا جیسے اسکے گلے کو کسی نے تیز دھار آلے سے کاٹ دیا ہو، حسن وہیں زمین پر لوٹ پوٹ ہوگیا۔

حسن کی امی یہ دیکھ کر گھبرا گئیں کہ اچانک میرے بیٹے کو کیا ہوگیا ہے ؟حسن کی امی نے جلدی سے حسن کو سیدھا کرکے بستر پر لٹایا اور پوچھا کہ کیا ہواہے بیٹا؟

حسن مسلسل چیخے، چلائے جا رہا تھا، اس کے گلے سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں، اسکے منہ سے ہلکا سا خون بھی باہر نکل رہا تھا۔ اب حسن کو یقین ہوگیا تھا کہ اسکے گلے میں کوئی چیز موجود ہے جسکی وجہ سے اسکی یہ حالت ہوگئی ہے۔ حسن کی امی یہ سب دیکھ کر سٹپٹا گئیں اور زور زور سے سب گھر والوں کو آوازیں دینے لگیں، حسن کے ابو،دادا، دادی، بہن، بھائی سب دوڑے چلے آئے، اور حسن کی حالت دیکھ کر سب گھبرا گئے۔

حسن کے دادا نے جلدی سے پانی منگوایا اور حسن کو بہت سا پانی پلایا لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ حسن کا درد اور ٹھیس ویسی ہی رہیں، اس کی حالت غیر ہو رہی تھی، وہ دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا، جب اس نے چوری چھپے وہ کیک کھایا تھا۔

حسن کی دادی اماں نے ایک روٹی کا ٹکرا منگوایا اور حسن کے منہ میں ڈال دیا، حسن نے اس روٹی کے ٹکڑے کو باہر اگل دیا، اس سے کچھ نہیں کھایا جا رہا تھا۔

تب حسن کے ابو نے سختی سے پوچھا کہ حسن سچ سچ بتاؤ کیا کھایا تھا جس کی وجہ سے یہ حالت ہورہی ہے ، حسن نے جب یہ دیکھا کہ اب بتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، تو اس نے روتے ہوئے شرمندہ لہجے میں سب کو بتادیا کہ اس نے دوکاندار کی نظروں سے بچ کر ایک کیک کھایا تھا تب سے اس کے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی ہے۔

حسن کے ابو نے ایک خشک روٹی کا بڑا سا ٹکڑا منگوایا اور حسن کو اسکے نگلنے کا حکم دیا، حسن نے بہت انکار کیا، مگر اس کی ایک نہ چلی، مجبوراً اس نے وہ ٹکڑا منہ میں رکھا اور اسے نگلنے کی کوشش کرنے لگا، حسن کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، وہ برے برے منہ بنا رہا تھا، اور دل میں اپنے آپ پر لعن طعن کررہا تھا کہ کاش وہ کیک کھانے کی غلطی نہ کرتا۔

حسن مسلسل اس خشک روٹی کے ٹکڑے کو نگلنے کی کوشش کررہاتھا، کہ اچانک اسے زوردار ابکائی آئی اور مسلسل قے شروع ہوگئیں، جیسے ہی قے رکی، حسن کو گلے میں کچھ سکون محسوس ہو، اسے محسوس ہورہا تھا کہ اب اسکے گلے میں کوئی چیز نہیں ہے، اب اسے درد بہت کم محسوس ہورہا تھا۔

حسن کے ابو اب اس قے کو دیکھ رہے تھے کہ آخر کیا چیز حسن کے گلے میں پھانس بن کر اسے تکلیف دے رہی تھی۔اچانک حسن کے ابو کو کسی کالی سی چیز کے ٹکڑے نظر آئے، غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ چیونٹے کا پچھلا حصہ ہے اور یہی چیونٹا حسن کے گلے میں پھنس گیا تھا، اسی کے کاٹنے کی وجہ سے حسن کی حالت غیر ہوگئی تھی، چیونٹے دیکھ کر اب سب کو یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ جب حسن نے جلدی سے کیک اٹھا کر منہ میں ڈالا تھا، تو اس وقت وہ چیونٹا اس کیک پر بیٹھا تھا، وہ بھی کیک کے ساتھ حسن کے منہ میں چلا گیا ، لیکن پیٹ میں جانے کی بجائے حلق میں پھنس کر رہ گیا، اور باہر نکلنے کی مسلسل کوشش کرنے کی وجہ سے حسن کو یہ سب کچھ جھیلنا پڑا۔حسن کو اس کے کیے کی سزا مل چکی تھی۔وہ سب گھر والوں کے سامنے نادم کھڑا تھا۔حسن کے ابو نے حسن کو گلے سے لگا لیا اور معاف کر دیا۔اور وعدہ لیا کہ آئندہ حسن کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

اگلے دن جب حسن کی حالت کچھ سنبھل گئی تو حسن کی امی نے حسن کو پانچ روپے دیے اور کہا کہ جاؤ بیٹا یہ پیسے دکاندار کودے آؤ ۔یہ اس کیک کے پیسے ہیں جو تم نے کل کھایا تھا،حسن اسی دوکان پر چلا گیا اور دکاندار سے کہا کہ معذرت انکل،کل آپکی دوکان سے میں نے غلطی سے کیک کھایا تھا اور پھر حسن نے جیب سے پیسے نکالے اور دوکاندار کی طرف بڑھا دیئے ۔دوکاندار حسن کی اس ایمانداری کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور سامنے پڑے ہوئے اسی کل والے کیک کی طرح ایک اور کیک نکال کر حسن کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔یہ کیک لے لو بیٹا،یہ میری طرف سے اس ایمانداری کا انعام سمجھ کر کھا لو،حسن نے جیسے ہی کیک دیکھااسے کل خود کے ساتھ بیتا ماجرا یاد آگیا،اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسکے گلے میں پھر سے کوئی چیز پھنس گئی ہوحسن فورا گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔دوکاندار حسن کو یوں بھاگتا دیکھ کر حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ کتنا پیارا اور نیک بچہ ہے،ایسا بچہ آجکل کہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔اب اسے کیا معلوم کہ حسن کے ساتھ یہ کیک کھانے کی وجہ سے کیا بیتی۔حسن نے گھر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ کبھی چوری نہیں کرے گا اور نہ ہی کبھی کیک کھائے گا۔یوں حسن کی پہلی غلطی اس کی آخری غلطی بن گئی۔

§§§

آخری گولی

مصنف: سفیان خان

وہ کل پانچ افراد تھے، تین مرد اور دو عورتیں۔ شام کے وقت ساحلِ سمندر کے ایک ویران گوشے میں، پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دائیں طرف سمندر کی منہ زور لہریں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں اور بائیں طرف ایک اونچی چٹان سر اٹھائے کھڑی تھی، جو کسی پہاڑی کا باقی ماندہ حصہ تھی۔ چند قدم دور چار پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں اس گروپ کے چیف کا نام تھا شفقت اگرچہ شفقت نام کی کوئی چیز اس کے چہرے پر دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا، چٹان کی طرح مضبوط اور پتھر کی طرح پتھریلا۔ چیف نے اچانک پہلو بدلا اور بولا :

"خواتین و حضرات آپ سب ملک کی خفیہ تنظیم کے ارکان ہیں۔ آپ کی مناسب کارکردگی کو مدِنظر رکھ کر آپ کو ایک خفیہ مشن سونپا گیا۔ آپ میری ہدایات کے مطابق اپنا کام احسن طریقے سے سر انجام دیتے رہے مگر پھر ہم میں سے کسی نے ایک "کارنامہ" بھی سر انجام دے دیا، خفیہ سی ڈی کے چند منتخب حصے دشمن کے ہاتھوں فروخت کردیے گئے۔"

چیف پھر اچانک خاموش ہو گیا وہ گرم نظروں سے ایک ایک کا چہرہ پڑھ رہا تھا، ہر ایک کو بری طرح گھور رہا تھا، بات ہی ایسی تھی، ملک سے غداری اور تنظیم سے بے وفائی۔ چیف نے سرد ہوا سے بچاؤ کے لیے عمدہ اونی مفلر لے رکھا تھا۔ اس نے اپنا چرمی تھیلا کھول کراس میں سے ایک سیاہ بڑا پستول نکالا۔اس ماحول میں اس کی کرخت آواز پھر گونجی:

"غداری کی سزا موت ہوتی ہے، آپ سب جانتے ہیں کہ خفیہ ادارے غدار کو موت کے گھاٹ اتار کر دوسرے برے افراد کے لیے عبرت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کیا کسی کو اس بات پر اعتراض تو نہیں کہ غدار کومارا نہ جائے؟"

"نو چیف"چند ملی جلی آوازوں نے سر جھکا دیا۔

"گڈ تو گویا آپ سب اس تنظیم کے اچھے کارکن ہیں۔" چیف نے اپنی جیب میں سے تین گولیاں نکال کر پستول کو کھولا اور اس کے چیمبر میں وہ گولیاں ڈال دیں ۔ پھر پستول کی نال ہوا میں بلند کی اور ٹریگر دبا دیا۔چیف نے دو گولیاں فضا میں چلا کر ضائع کر دیں۔ اب آخری گولی باقی تھی۔

"غدار کی قسمت کا فیصلہ اب یہ آخری گولی کرے گی۔" چیف نے زبان کھولی تو سب کے چہروں پر ایک رنگ آ کر گزرگیا۔ غدار کی نامزدگی کے بغیر ہر ایک شخص اپنے آپ کو مجرم اور غدار سمجھ رہا تھا کہ کہیں غداری کا اس پرکوئی الزام تو نہیں لگ گیا۔

چیف نے پستول دوبارہ کھول کر اس کا چیمبر گھما دیا اور پھرا چانک پستول بند کر دیا۔ اس نے سب کو ترچھی نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ "معزز خواتین و حضرات آپ سب شریف، ایمان دار اور پارسا افراد ہیں۔ آپ ملک کی اس خفیہ تنظیم کے ساتھ بھی مخلص ہیں۔ میں کسی بھی فرد پر غداری کا الزام لگا کر اس پر کیچڑ اچھالنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ یہ بات بہت بڑا "گناہ" ہے کہ کسی پر بہتان باندھا جائے، لہٰذا میں اس آخری گولی کا ہی فیصلہ تسلیم کروں گا دیکھئے، یہ گولی کیا فیصلہ کرتی ہے۔ میں اس عمل کا آغاز خود سے کرتا ہوں۔ میری آپ سب کے لیے دلی دعا ہے کہ آخری گولی صرف غدار کا ہی کام تمام کرے۔ مجھے اس طریقے پر بھروسا ہے۔ میں چند سال قبل بھی آخری گولی کی مدد سے غدار کو سزا دے چکا ہوں بلکہ قسمت غدار کو خود ہی ڈھونڈ لیتی ہے۔"

چیف نے پستول کی نالی اپنی کنپٹی پر رکھی، آنکھیں بند کیں اور پستول کی لبلبی دبا دی

"کلک۔"

اس نے آنکھیں کھول کر خدا کا شکر ادا کیا اور پستول شاد صاحب کے حوالے کیا۔ شاد صاحب نے گہرا سانس لیا اور پستول کی نالی اپنے سر پر رکھ کر پستول چلا دیا

" کلک۔"

شاد صاحب جی کر مراٹھے تھے۔ انہوں نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پستول عبدالقیوم صاحب کے حوالے کر دیا۔ عبدالقیوم صاحب چار بچوں کے باپ تھے انہوں نے زیرِ لب خدا سے دعا کی۔ ساری دنیا ان کے سامنے پل بھر میں سمٹ آئی۔ وہ غدار تو نہیں تھے مگر اس آخری گولی کا بھلا کیا بھروسا۔ انہوں نے خالقِ کائنات کو پکار کر پستول کی نالی اپنے ماتھے پر رکھی اور اس کی لبلبی دبا دی۔

" کلک۔"

وہ بچ گئے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں شکرانے کے نفل ادا کرنے کا تہیہ کر لیا۔

پستول اب شمسہ کے ہاتھ میں تھا۔ شمسہ سخت گیر عورت دکھائی پڑتی تھی۔ عمر چالیس سال، تین بیٹوں کی ماں اور ایک بوڑھی بیمار ماں کی واحد خبر گیر۔ اس نے پستول تھام کر قدرے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا: "چیف میں غدار نہیں ہوں ، آپ میرا ریکارڈ چیک کر لیں اور کوئی ثبوت مل جائے تو مجھے الٹا لٹکا کر میری چمڑی اتار دیں، پھر مجھے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیں۔"

"نہیں، آپ تو بہت اچھی ہیں۔" چیف نے طنز کیا۔

"تو پھر؟"

"پھر فیصلہ آخری گولی کا ہو گا، جو اس پستول کے چیمبر میں گھوم رہی ہے۔"

"چیف میرے تین چھوٹے چھوٹے بیٹے ہیں جو رات کے کھانے پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور میری بوڑھی ماں میرا حد درجہ شریف خاوند۔"

"اوہ آپ مجھے رلانے والی باتیں نہ کریں۔" چیف کی آواز بھی رندھ گئی۔ وہ اگرچہ اداکاری کر رہا تھا مگر کامیاب اداکاری کر رہا تھا۔

چیف کے بے لچک رویے اور بے لحاظ نظروں نے شمسہ کو بتا دیا کہ اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ تب اس نے لرزتے ہاتھ سے پستول بلند لیا۔ پستول کی نالی اپنے سر پر رکھ لی اور کلمہ توحید کا ورد کرتے ہوئے لبلبی دبا دی۔

آواز صرف "کلک" کی ابھری

چیف نے اسے نئی زندگی کی مبارک باد دی، جو اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کی۔

پستول اب مس کرن کے پاس تھا۔ کرن تیس سالہ لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر حد درجہ معصومیت کا غلبہ تھا۔ چیف نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ آخری گولی اس پستول میں جہاں کہیں بھی تھی، گھوم گھام کر پستول کے نالی کے عین سامنے یا بالکل قریب آچکی تھی۔ پستول چار بار چلایا جا چکا تھا اور اب خطرہ نوے فیصد سے بھی بڑھ چکا تھا، آر یا پار والا معاملہ تھا۔

"گولی چلائیں مس کرن" چیف نے اسے حکم دیا۔

تب پستول کرن کی گود میں پڑا تھا۔ اس نے شش و پنج میں مبتلا ہو کر پستول تھام لیا۔ اس نے ذرا ٹھہر کر کہا: "اندھی گولی کا فیصلہ اندھا ہوگا، میں نے کیا کیا ہے چیف کہ مجھے بھری جوانی میں موت کی گھاٹی میں دھکیلا جا رہا ہے۔"

چیف نے سخت لہجہ اختیار کیا: "اس پستول میں چھ گولیوں کی جگہ ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ آخری گولی اب نالی کے سامنے پہنچ چکی ہو۔ معاملہ اگرچہ بہت خطرناک تھا مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے بعد میں پستول کو اپنی کنپٹی پر رکھ کر چلاؤں گا اگر ایسا وقت یا تو"چیف نے ان سب کو دیکھ کر کہا۔ "میں خود کو سب سے پہلے سزاوار سمجھتا ہوں، اس لیے اس عمل کا آغاز میں نے خود سے کیا تھا اور انجام بھی وقت پڑنے پر خود ہی پر کروں گا مس کرن بے دھڑک گولی چلائیں اگر یہ غدارِ وطن نہ ہوئیں تو ان کی زندگی خواب نہیں ہو گی۔"

خوف زدہ کرن خاموش بیٹھی رہی۔

"مس کرن گولی چلائیں، اپنے چیف کا حکم ٹالنا بھی جرم ہے۔"

پھر کرن نے اچانک ہاتھ سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ فضا دھماکے سے گونج اٹھی تھی۔ چٹان پر بیٹھے ہوئے آبی پرندے اور سمندری بگلے اڑ گئے تھے۔ چیف چیخ کر پتھر پر سے نیچے گرا تھا اور اس نے اپنا سینہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے ریت پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا ۔ کرن ماہر نشانہ انداز تھی وہ کئی بار نشانہ اندازی کے مقابلوں میں انعام حاصل کر چکی تھی۔ اس نے اپنے فن کا مظاہرہ چیف کے عین دل پر کیا تھا۔ چیف کا حکم نہیں ٹالا تھا۔گولی تو چلائی تھی مگر اپنے سر پر نہیں، چیف کے سینے پر کرن نے وہ پستول پھینک

کر اپنے لباس میں سے ایک مائوزر نکال کر باقی ماندہ افراد پر تان لیا تھا تاکہ کوئی اسے روک نہ سکے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہی تھی تاکہ چند قدم دور جا کر اپنی گاڑی میں سوار ہوسکے۔ اس نے گھوم کر اپنی گاڑی کی طرف دیکھا اور یہی لمحہ قیامت بن گیا اچانک اسے کسی نے فضا میں گیند کی طرح اچھال دیا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گری تو مائوزر بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا ۔ اس کو شاد صاحب نے اپنے شکنجے میں قابو کر لیا۔ اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ خاک میں غلطاں چیف پتھر پر پائوں دھرے کھڑا تھا اور اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔چیف کے ہاتھ میں ایک چھوٹا پستول تھا جو اس نے یقینا اپنے اونی مفلر میں سے نکالا تھا وہ آخری گولی سے بچ نکلا تھا۔

چیف نے کہا: "مجھے تجھ پر پہلے ہی یقین کی حد تک شک تھا۔ میری خفیہ اطلاع کے مطابق تو نے ہیروں والے زیورات خریدے ہیں اور دنیا کے ایک مہنگے شہر میں بنگلہ بھی۔ کرن بی بی وہ آخری گولی، پٹاخا گولی تھی۔ میں اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ غدار تلاش کرنے کے لیے اندھی گولی کی مدد لیتا۔ میں نے جب چیمبر کو گھمایا تو بند کرتے وقت میں نے پستول کا چیمبر اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کی مدد سے یوں روکا تھا کہ پٹاخا گولی پانچویں خانے میں تھی۔ میں نے تم لوگوں پر نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا اور یوں غدار لڑکی پکڑی گئی۔"

کرن جب تم مائوزر تھام کر قدم قدم، الٹے پائوں پیچھے ہٹ رہی تھی تو میری طرف تیرا دھیان نہیں تھا اور جب تم نے گاڑی کی طرف پلٹ کر مجھے ایک لمحہ دیا تو میں نے تجھے اٹھا کر فضا میں اچھال دیا، شاید تیرے علم میں نہ ہو کہ میں ایک ماہرِ نفسیات ہوں اور نجا ماسٹر بھی۔"

§§§

بہادر لڑکا

مصنف: اسد احمد

بیان کیا جاتا ہے۔ ایک بادشاہ کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو گیا کافی دن علاج کرنے کے باوجود جب اسے آرام نہ آیا تو طبیبوں نے صلاح مشورہ کر کے کہا کہ اس بیماری کا علاج صرف انسان کے پتے سے کیا جاسکتا ہے اور وہ بھی ایسے انسان کے پتے سے جس میں یہ یہ خاص نشانیاں ہوں۔ یہ کہہ کر حکیموں نے وہ نشانیاں بتائیں اور بادشاہ نے حکم دے دیا کہ شاہی پیادے سارے ملک میں پھر کر تلاش کریں اور جس شخص میں یہ نشانیاں ہوں اسے لے آئیں۔ پیادوں نے فوراً تلاش شروع کر دی۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ وہ ساری نشانیاں ایک غریب کسان کے بیٹے میں مل گئیں۔ پیادوں نے کسان کو ساری بات بتائی کہ بادشاہ کے علاج کے لیے تیرے بیٹے کے پتے کی ضرورت ہے۔ اسے ہمارے ساتھ بھیج دے اور اس کے بدلے جتنا چاہے روپیہ لے لے کسان بہت غریب تھا۔ ڈھیر سارا روپیہ ملنے کی بات سن کر وہ اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ سپاہی اس کے بیٹے کو لے جائیں۔ چنانچہ وہ اسے بادشاہ کے پاس لے آئے۔

خاص نشانیوں والا لڑکا مل گیا تو اب قاضی سے پوچھا گیا کہ اسے قتل کر کے اس کے جسم سے پتا نکالنا جائز ہو گا یا نہیں! قاضی صاحب نے فتویٰ دے دیا کہ بادشاہ کی جان بچانے کے لیے ایک جان کو قربان کر دینا جائز ہے۔

قاضی کے فتوے کے بعد لڑے کو جلّاد کے حوالے کر دیا گیا کہ وہ اسے قتل کر کے اس کا پتا نکال لے لڑکا بالکل بے بس تھا۔ وہ اپنے قتل کی تیاریاں دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ لیکن جب جلاد تلوار لے کر اس کے سر پر کھڑا ہو گیا تو اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

بادشاہ خود اس جگہ موجود تھا۔ اس نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ جلّاد کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر تو بڑے بڑے بہادر خوف سے کانپنے لگتے ہیں۔ اس نے جلّاد کو رکنے کا اشارہ کر کے لڑکے کو اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھا لڑکے۔ یہ تو بتا، اس وقت مسکرانے کا کون سا موقع تھا؟

لڑکے نے فوراً جواب دیا، حضور والا دنیا میں انسان کا سب سے بڑا سہارا اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میرے ماں باپ نے روپے کے لالچ میں مجھے حضور کے سپرد کر دیا۔ ماں باپ کے بعد دوسرا سہارا انصاف کرنے والا قاضی اور بادشاہ ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی ظالم کسی کو ستائے تو وہ اسے روکیں۔ لیکن قاضی اور بادشاہ نے بھی میرے ساتھ انصاف نہ کیا اب میرا آخری سہارا خدا کی ذات تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ جلّاد ننگی تلوار لے کر میرے سر پر پہنچ گیا اور خدا کا انصاف بھی ظاہر نہیں ہو رہا۔ بس یہ بات سوچ کر مجھے ہنسی آ گئی۔

لڑکے کی یہ بات سنی تو بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے حکم دیا کہ لڑکے کو چھوڑ دو۔ ہم یہ بات پسند نہیں کرتے کہ ہماری جان بچانے کے لیے ایک بے گناہ کی جان لی جائے۔

لڑکے کو اُسی وقت چھوڑ دیا گیا۔ بادشاہ نے بہت محبت سے اسے اپنی گود میں بٹھا کر پیار کیا۔ اور قیمتی تحفے دے کر رخصت کیا۔ کہتے ہیں۔ اسی وقت سے بادشاہ کی بیماری گھٹنی شروع ہو گئی اور چند دن میں ہی وہ بالکل تندرست ہو گیا۔

میں نے دیکھا بر لب دریائے نیل اک فیل باں اپنی دھن میں زیر لب کرتا تھا کچھ ایسا بیاں غور کر ہاتھی کے پیروں میں جو ہو گا تیرا حال ہو گی تیرے پاؤں میں بس یونہی مور ناتواں

وضاحت:اس حکایت میں حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے یہ نکتہ بیان کیا ہے۔ کہ جان خواہ بادشاہ کی ہو یا غریب کی، قدر و قیمت میں دونوں برابر ہیں۔ نیز یہ کہ خود غرض بن کر دوسروں کی جانیں پامال کرنے والے دنیاوی لحاظ سے بھی اتنے فائدے میں رہتے جس قدر نفع میں خلق خدا پر رحم کرنے والے رہتے ہیں۔

§§§

بھوت

مصنف: شیخ محمد عثمان فاروق

قدیم گرجا گھر کی اونچی اونچی دیواروں پر بہت سے تراشیدہ پتھر رکھے ہوئے، ان میں سے کچھ فرشتوں کے مجسمے تھے، کچھ پادریوں اور بادشاہوں کے اور کچھ پاکیزہ شخصیات کے ۔ گرجا گھر کے ایک کونے میں ایک بدرنگ اور بے ڈھنکا پتھر پڑا تھا ،جس پر نہ کوئی تاج بنا ہوا تھا ،نہ ہی اس کی کوئی شکل و صورت سمجھ آرہی تھی۔ گرجا گھر میں رہنے والے موٹے نیلے کبوتروں نے سمجھا کہ شاید کوئی بھوت ہے مگر مذہبی رسومات کے انچارج کوے نے انہیں بتایا کہ یہ ایک گم شدہ رُوح ہے۔سردیوں کا کوئی دِن تھا،گرجا گھر کے چھت پر ایک سریلی آواز والے پرندے کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی ،جو سخت سردی کے باعث دھوپ تلاش کرتا ہوا گرجا گھر کی باڑ پر آبیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ معصوم پرندہ ایک فرشتے کے مجسمے پر آبیٹھا، وہ چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد یہاں گھونسلا بنالے۔

گرجا گھر میں موجود چڑیوں اور کبوتروں نے اسے وہاں رہنے سے روک دیا اوراس قدر شور مچایا کہ اسے وہ جگہ چھوڑنا پڑی۔معصوم پرندہ وہاں سے اڑکر، گم شدہ رُوح کی تصویر والے بدصورت پتھر پر جابیٹھا اور اسے ہی پناہ گاہ بنالیا۔ گرجا گھر کے کبوتر اس پتھر کو محفوظ جگہ نہیں سمجھتے تھے ،کیونکہ ایک تو وہ گمنام سے کونے میں پڑا تھا دوسرا ،اس پر ہر وقت گہرا سایہ موجود رہتا تھا۔ گم شدہ روح کا مجسمہ اگرچہ بدرنگ تھا اور اس کے بازو اس طرح کھلے ہوئے بنے تھے جیسے وہ اپنے دشمن کو للکار رہا ہو، لیکن اس سے کسی کو کوئی تکلیف نہ تھی، معصوم پرندہ وہیں رہنے لگا۔ وہ روزانہ خاموش مجسمے کے اوپر چڑھ جاتا اور خوابوں میں کھوئے دوسرے مجسموں کو دیکھتا رہتا، معصوم اور کمزور پرندے کے لیے یہ واحد محفوظ پناہ گاہ تھی اور وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا، روزانہ وقفے وقفے سے مجسمے کے اوپر بیٹھتا، کبھی قریبی ستون پر چڑھ جاتا اور مجسمے کی محبت اور پناہ دینے کے لیے شکریہ کے طور پر گیت گاتا رہتا۔ یہ بدصورت پتھر کے لیے خوشی کے دن تھے کیونکہ اس کا مہمان پرندہ روزانہ وہاں چہکتا، ہر روز سریلی آواز میں گیت گاتا، شام کو گرجا گھر کی گھنٹی بجتی تو چمگادڑ رینگتے ہوئے آہستگی سے اپنے گھروں سے نکل آتے اور پرندہ گیت گاتا رہتا۔

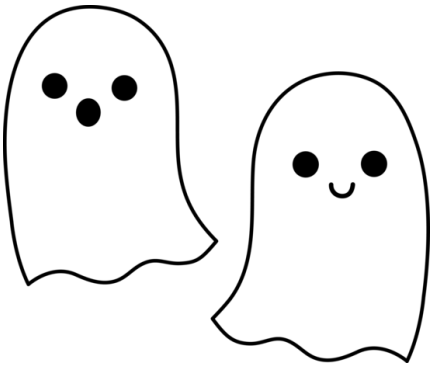

یہ موسم کی تبدیلی تھی یا طوفانی بارشوں کا اثر یا کوئی وجہ تھی کہ بدصورت پتھر کی سختی اور اس کی شکل میں خوشگوار تبدیلی آرہی تھی۔گرجا گھر کی چھت پر خوبصورت نغمے سناتے پرندے کی آواز سب کو پسند تھی مگر وہ اس پر افسوس کرتے یہ آواز ہمیشہ رہنے والی نہیں، یہ خوبصورت گیت ختم ہوجائیں گے اور گرجا گھر کی دیواریں معصوم پرندے کو بھول جائیں گی۔ گرجا گھر کے مکینوں نے ،ایک دن معصوم پرندے کو پنجرے میں قید کرکے گرجا گھر کے باہر فروخت کرنے کے لیے رکھ دیاتاکہ کچھ معاشی فائدہ حاصل کیا جاسکے۔ وہ رات معصوم پرندے پر بہت بھاری تھی ،جو اس نے اپنے ٹھکانے سے دور گزاری۔اِدھر بدصورت پتھر پریشان ہوا کہ پرندہ واپس کیوں نہیں آیا، اس نے سوچا شاید اسے بلی کھاگئی ہے یا پھر کسی نے پتھر مارکے زخمی کردیا ہے، مہمان پرندے کے بغیر گم شدہ رُوح کے بدصورت مجسمے کو پہلی تنہائی کا شدید احساس ہوا۔

صبح سویرے جب گرجا گھر کی چڑیوں کا شور اٹھا اور لوگوں کی چہل پہل شروع ہوئی تو اسے معصوم پرندہ بہت یاد آیا، جب کبوتر گرجا گھر کو اونچی دیواروں کے کنگروں پر بیٹھتے اور چڑیاں چہکتیں تو اس کے کانوں میں معصوم پرندے کے گیت گونجنے لگتے۔

گم شدہ رُوح کا مجسمہ بہت اُداس او رغمزدہ تھا۔ کبوتر کھاتے وقت ہمیشہ اس معصوم پرندے کا ذکر کرتے اور کہتے کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ شدید سردی کے ایک دن اور کبوتر چڑیوں کے ساتھ گرجا گھر کی چھت خوراک کے لیے پریشان بیٹھے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ کوئی اپنا بچا ہوا کھانا چھت پر پھینکے تاکہ ان کی بھوک مٹ سکے، وہ اکثر سردیوں میں اسی طرح گزارہ کرتے تھے، اس دوران میں ایک کبوتر نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ کیا کچرے کے ڈھیر پر کوئی کھانے کی چیز پھینکی گئی ہے، جواب میں کبوتر کو بتایا گیا کہ نہیں، وہاں صرف ایک مردہ پرندے کو پھینکا گیا ہے۔

رات گئے گرجا گھر کی چھت پر کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مذہبی رسومات کے انچار ج کوے نے کہا کہ گرجا گھر کے کنگرے مدتوں سے موسم سرما کی شدت برداشت کررہے ہیں ، برفباری اور کہرے کے سبب ان کی حالت خراب ہے، شاید کوئی حصہ ٹوٹ گیا ہو۔ اگلی صبح گم شدہ رُوح کا مجسمہ اپنی جگہ موجود نہ پا کر کبوتروں نے اطمینان کا سانس لیا انہوں نے فیصلہ کیاکہ اب یہاں کسی اور فرشتے کا مجسمہ نصب کیا جائے گا، گم شدہ رُوح کے مجسمے کوکسی نے توڑ کر باہر پھینک دیاتھا۔

§§§

ترقی

مصنف: علی احمد

ایک گاؤں میں جھمرو اور منگلو نام کے دو دوست رہتے تھے۔ دونوں بہت غریب، جاہل اور سیدھے سادھے تھے۔ دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی دونوں اپنے اپنے خاندان کے ساتھ آپس میں مل جل کر رہتے تھے ۔دونوں فرصت کے وقت مندر کی صاف صفائی بھی کر لیا کرتے اور بیٹھ کر بھجن کیرتن کرتے تھے۔ یہی ان کا روزمرہ کا معمول تھا ۔ دونوں اپنی غریبی کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان تھے ۔ ایک دن مندر میں دونوں کی ملاقات ایک پنڈت جی سے ہوئی دونوں نے اُن سے اپنی پریشانیاں بتائیں۔ دونوں کی باتیں سُن کر پنڈت جی مسکرائے اور کہا : '' تم اس ترقی یافتہ دور میں اپنی بے وقوفی کی وجہ سے بے روزگار ہو۔ '' وہ دونوں پنڈت جی کی باتیں چپ چاپ سُنتے رہے ۔ پنڈت نے ان کی حالت بھانپ کر دونوں سے کہا: ''تم دونوں شہر جاکر اپنے لیے روزگار ڈھونڈ سکتے ہو یہاں پڑے پڑے تمہیں کچھ نہیں ملنے والا۔ بغیر محنت و مشقت کے دینے والا کچھ بھی نہیں دیتا۔''ان دونوں کو پنڈت کی بات سمجھ میں آگئی۔

یہ دونوں کبھی بھی گاؤں سے باہر نہیں گئے تھے۔ اس لیے شہر جانے سے ڈرتے تھے۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ اب کی بار گاؤں کی جاترا میں جب شہر کے لوگ آئیں گے تو ہم دونوں ان کے ساتھ شہر چلے جائیں گے۔

جھمرو اور منگلو شہر آگئے ۔ شہر کی چکا چوندھ سے وہ بھونچکے رہے گئے ۔ کام کی تلا ش میں دونوں کئی دنوں تک بھٹکتے رہے وہ جہاں بھی کام کی تلاش میں جاتے تو لوگ ان کے بارے میں پوچھتے اور کیا کام کر سکتے ہو یہ پوچھتے ۔ وہ دونوں شہر کے لوگوں کے سامنے کچھ ڈھنگ سے بول بھی نہیں پاتے تھے۔ اور لوگ انھیں دھتکار کر اپنے پاس سے بھگا دیتے۔

ایک دن ہمت کرکے کام ڈھونڈنے نکلے تو اناج کے گودام میں کام مل گیا ۔ کام تھااناج کی بوریاں ڈھونا، جھمرو اور منگلو محنتی تو تھے ہی، اپنی محنت اور لگن سے کام کرنے لگے اب دھیرے دھیرے ان کی تکلیفیں دور ہونے لگیں۔ جھمرو اور منگلو اپنی کمائی کے پیسے اکٹھے ہی رکھتے اور تھوڑی بہت بچت بھی کرتے ۔ دن گذرتے گئے اب ان کے رہنے کا مسئلہ بھی دور ہوگیا ، انھوں نے کرایے پر ایک کمرہ لے لیااور گاؤ ں جاکر اپنے اپنے خاندان کو شہر لے آئے دونوں کی بیویاں چمیلی اور بیلا بھی کام کرنے لگیں اور اپنی کمائی ساتھ ہی رکھنے لگیں اُن دونوں کے بچّے پڑھنے کے لیے اسکول بھی جانے لگے۔

جب کمائی بڑھنے لگی تو جھمرو کی بیوی چمیلی کے دل میں لالچ پیدا ہوا اور وہ کمائی کے پیسوں میں سے کچھ پیسے الگ نکال کر اپنے اور اپنے بچوں کا شوق پورا کرنے لگی اور منگلو کی بیوی بیلا اور اس کے بچوں سے بھید بھاؤ کرنے لگی ۔ بیلا اس کی ان حرکتوں کو سمجھ گئی ، چمیلی فضول خرچ اور لالچی تھی وہ چالاکی سے اپنے داو پیچ چلاتی جب کہ بیلا سمجھ دار اور اچھی عادتوں کی مالک تھی۔ ایک دن بیلا نے چمیلی سے کہا کہ کیوں نہ ہم دونوں اپنا کام الگ الگ کریں اوراپنی اپنی کمائی بھی اپنے پاس رکھیں چمیلی کو یہ بات پسند آئی اور وہ مان گئی۔

کچھ دنوں بعد جھمرو اور منگلو بھی اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ الگ الگ رہنے لگے ۔ چمیلی کی لالچی طبیعت اور فضول خرچی کی خراب عادتوں کی وجہ سے جھمرو اور اس کے خاندان کے لوگ پریشان رہنے لگے ۔ جب کہ بیلا کی سمجھ داری اور کفایت شعاری سے منگلو ترقی کرنے لگا۔ بیلا تھی تو سمجھ دار لیکن پڑھی لکھی نہیں تھی اس نے پڑھنا لکھنا سیکھا اور منگلو کو بھی سمجھایا کہ علم سیکھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی ، جب جاگے تب سویرا ، منگلو نے بھی پڑھنا سیکھ لیا اورترقی کرتے ہوئے اپنے بچوں کو اعلا تعلیم دلوائی آج منگلو اور بیلا کے بچے ڈاکٹر اور انجینئر بن گئے ہیں، جب کہ جھمرو اور چمیلی اپنی خود کی حرکتوں سے گاؤں سے بھی نچلے درجے کی زندگی گذارنے پر مجبور ہوگئے ۔ہوا یوں کہ اس دوران چمیلی بھی مر گئی ۔

یہ بات منگلو کو پسند نہ آئی کہ اُس کا دوست جھمرواس طرح پریشان رہے اُس نے بڑھ کر اپنے دوست کی مدد کی اور اُس کے بچوں کی تعلیم کے لیے اچھا انتظام کیا اورنائٹ اسکول میں ان کا داخلہ کرادیا۔ دھیرے دھیرے ایک دوست کی مدد سے دوسرا دوست بھی ترقی کرنے لگا ۔اب جھمرو کے بچے بھی ٹیچر بن کر محنت سے پڑھانے کا کام کررہے ہیں ۔ سچ ہے کہ فضول خرچی سے ہمیشہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے جب کہ کفایت شعاری سے ترقی ہوتی ہے۔

§§§

تین دوست

مصنف: سفیان خان

چیں چوبلی اور توتو کتا مل کر کھیل رہے تھے۔ چیں چو نے توتو کو دھکا مارا۔ توتو گر پڑا۔ چیں چو تالی بجانے لگی۔ '' گرا دیا ، ... گرادیا ...''

تو تو اٹھ گیا۔ اس پر تھوڑی مٹّی لگ گئی تھی ۔ اس نے مٹّی جھاڑی اور چیں چو سے بولا:'' میں گراؤں تو کہنا مت کہ گرا دیا۔'' ایسا دھکا ماروں گا کہ تم لڑھکتی چلی جاؤ گی۔''

'' تم گرا ہی نہیں سکتے۔'' چیں چو ہنسنے لگی۔

''اچھا۔''.....''ہاں!''

'' تو تیار ہوجاؤ۔''.....چیں چو پنجے گڑا کر کھڑی ہوگئی ۔

توتو جانتا تھا کہ چیں چو پنجے گڑا کر کھڑی ہوجائے گی اور وہ اسے گرانہیں پائے گا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس آیا اور دھکا مارا ۔ چیں چو ذرا سی ڈگمگا کر رہ گئی۔

تم میں توبہت طاقت ہے ۔ میں سچ مچ تم کو نہیں گرا پایا۔'' توتو بولا۔

''میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا ۔'' اتنا کہہ کر چیں چو آرام سے کھڑی ہوگئی۔ توتو ہوشیاری سے یہ سب دیکھ رہا تھا ۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹا اور تیزی سے آکر ایک دھکا مارا۔ چیں چو زور سے لڑھک کر زمین پر گر گئی۔ اب تالی بجانے کی باری توتو کی تھی وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

چیں چو اور تو تو دونوں بہت کھلنڈرے تھے وہ دونوں اس وقت مذاق ہی تو کررہے تھے۔ چیں چو کھڑی ہوگئی ۔ اس نے بھی اپنے جسم پر لگی دھول مٹّی جھاڑی اور بولی :'' ایسادھکا دینے سے کیا ہوتا ہے ؟ ذرا پہلے ہی بول کر دیتے تو سمجھ میں آتا مجھے نہیں گرا سکتے تھے۔''

توتو کچھ نہیں بولا اور ہنستا رہا ۔

اس کے بعد توتو کہیں سے گیند اٹھا لایا ۔ دونوں کچھ دیر گیند سے کھیلتے رہے۔

شام ہورہی تھی ۔ توتو بولا:'' چیں چو! اب میں گھر جاؤں گا۔ آج تو کھیلتے کھیلتے تھک گیا ہوں ۔ ماں انتظار کررہی ہوگی ۔ آج وہ کچھ دیر بعد مجھے کہیں گھمانے لے جائیں گی۔''

'' تو جلدی جاؤ!'' چیں چو بولی ۔ ' میں بھی تھک گئی ہوں ۔لیکن کل مجھے ضرور بتانا کہ تم کہاں گھومنے گئے تھے۔ '' وہ پھر بولی۔ '' کل میری ماں مجھے کچھ نئی چیز کھانے کو دینے والی ہیں مگر مجھے بتایا نہیں ہے۔ دیکھیں کیا دیتی ہیں؟ ''

تو تو اپنے گھر چل دیا اور چیں چو اپنے گھر۔ دونوں کو الگ الگ سمت جانا تھا۔

جب چیں چو اپنے گھر جارہی تھی۔ راستے میں پھدکو بندر ملا ۔ وہ درخت کی ایک شاخ پر بیٹھا تھا۔ چیں چوکو دیکھتے ہی شاخ پر سے بولا:'' کھو کھو... کھوکھو۔''

چیں چوں سمجھ گئی کہ یہ پھدکو بندر ہے۔

'' ارے بھئی! کیا حال ہے؟ نیچے تو آؤ۔ '' چیں چو بولی۔ '' کچھ کہنا ہے کیا؟''

'' کہنا تو ہے لیکن نہیں کہوں گا۔ آج کل تو تم توتو کے ساتھ زیادہ کھیلتی ہو۔ میں تو درخت کی شاخ پر اکیلا بیٹھا رہتا ہوں ،تم کو تو میرا خیال ہی نہیں رہتا۔'' پھدکو نے شکایت کی ۔

'' تو تم بھی کھیلا کرو ہمارے ساتھ ، بڑے برگد کے پاس آجایا کرو ۔ وہیں توتو آتا ہے ہم تینوں مل جُل کر کھیلا کریں گے۔ '' چیں چو نے دوستا نہ انداز میں کہا۔

''ہاہا... ہاہا... ہاہا '' پھدکو زور سے ہنسا اور کہنے لگا: '' میں تو ۔ توتو کے ساتھ نہیں کھیلوں گا ۔ نہ جانے کب وہ مجھے کاٹ لے ؟ جب وہ بھونکتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے بادل گرج رہا ہو۔ مجھے تو اُس سے بہت ڈر لگتا ہے ۔''

'' تم بے کار میں توتو سے ڈر رہے ہو۔'' چیں چو بولی۔

'' میں بے کار میں نہیں ڈررہا ہوں ۔ بل کہ صحیح معنوں میں ڈررہاہوں ۔'' پھدکو نے کہا۔اور پھر سرگوشی کے انداز میں چیں چو کو بولنے لگا کہ :'' میں تو کہوں گا کہ اب تم بھی اُس کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دو ۔ نہیں تو وہ کسی دن تمہیں بھی ضرور دھوکا دے گا ۔ اور تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گایا تمہادی دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے ۔ ''

'' یہ سب سراسر غلط ہے ۔'' چیں چو بولی۔

'' غلط بات نہیں ہے۔ '' پھدکو نے بات کاٹی اور آگے بولا:'' کیا بلی اور کتے کی کبھی دوستی رہ سکتی ہے ۔ بلی کتے کو دیکھ کر ہمیشہ ڈرتی رہی ہے ۔ کوئی وجہ ہوگی تب ہی تو بلی کتے سے ڈرتی ہے ۔ میں نے تمہاری بھلائی کے لیے یہ نصیحت کی ہے اب تمہاری مرضی تمہیں اس کے ساتھ کھیلنا ہے کھیلو یا مت کھیلو۔ لیکن یاد رکھنا وہ ضرور کسی دن تمہیں دھوکا دے گا ۔'' پھدکو نے پھر سے یہ بات دہرائی کہ :''وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گایا تمہادی دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے ۔ ''

'' یہ بات تو ٹھیک ہے کہ بلی اور کتے کی کبھی نہیں نبھتی لیکن یہ سب کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے ، ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست ہیں ۔'' چیں چو نے پھدکو سے کہا۔

''اچھا! دوسری مثال بھی سنو۔'' پھدکو بولا:'' شیر اور ہرن میں کبھی دوستی نہیں سنی گئی ۔ جب بھی شیر ہرن کو دیکھتا ہے ، وہ اس کو مارنے دوڑتا ہے ۔ اگر پکڑ لیتا ہے تو وہ ہرن کو مار ہی ڈالتا ہے ۔ اس لیے شیر ہرن کو دیکھ کر بھاگتی ہے۔ اسی طرح بلی اور کتے کا معاملہ ہے۔''

'' میں تمہاری اس بات سے اختلاف نہیں کرتی ۔'' چیں چو نے کہا۔اور بولی :'' بل کہ میں ایک مثال اور دیتی ہوں ، وہ بھی کسی دوسرے کی نہیں خود اپنی یعنی بلی اور چوہے کی ۔ بلی چوہے کی دشمن ہے ، وہ جہاں کہیں چوہے کو دیکھتی ہے اس کو مارڈالتی ہے ۔ لیکن کہیں بلی اور چوہے کی دوستی ہوئی ہے؟ میری اور توتو کی دوستی کی بات الگ ہے۔''

'' میں نے جو سمجھا وہ تمہیں بتادیا۔'' پھدکو بولا۔'' تم میری اچھی دوست ہو ۔اس لیے تم کو بتادیا ، نصیحت کردی ، اب تمہاری مرضی تم میری بات مانو یا نہ مانو ، لیکن یاد رکھنا وہ ضرور کسی دن تمہیں دھوکا دے گا ۔'' پھدکو نے پر سے یہ بات دہرائی کہ :''وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گایا تمہادی دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے ۔ ''

چیں چو کو پھدکو کی یہ باتیں اچھی نہیں لگیں۔ یہ تو کسی کی برائی بیان کرنا ہوا ، غیبت کرنا ہوا ۔ برائی اور غیبت تو دشمن کی بھی نہیں کرنی چاہیے ۔ غیبت کرنا یا کسی کی دوستی کو توڑنا یا کسی میں جھگڑا لگوادینا اچھی بات نہیں ہے بل کہ یہ تو سب سے بڑا دھوکا ہے ۔ اُس نے یہ باتیں پھدکو سے نہ کہی بل کہ من ہی من میں سوچتے ہوئے چپ چاپ اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

چیں چو اور توتو ہمیشہ کی طرح کھیلتے رہے ، ہنستے بولتے ، گاتے رہے ۔ چیں چو روز پھدکو کو کھیلنے کے لیے بلاتی رہی لیکن وہ باربار بلانے کے باوجود بھی کبھی ان کے ساتھ کھیلنے کے لیے نہیں آیا۔ وہ یہی کہتا رہا کہ توتو اُسے کاٹ لے گا ، وہ مجھے پسند نہیں ہے ۔ بل کہ وہ چیں چو سے اکثر کہتا کہ :'' وہ کسی دن تمہیں دھوکا دے سکتا ہے وہ تمہارے دونوں کان کاٹ کر کھاجائے گایا تمہادی دم چبا جائے گا۔ وہ بہت دھوکے باز ہے ۔ ''

وقت گذرتا رہا کہ ایک دن جھاڑی کے قریب سے چند لڑکے جارہے تھے ۔ ان کے ہاتھوں میں غلیلیں تھیں ، وہ صورت شکل سے ہی بڑے شرارتی لگ رہے تھے۔ چیں چو اور توتو جہاں کھیل رہے تھے وہ لڑکے وہیں سے گذرے تھے۔ اُن میں سے ایک نے کہا:'' میرا نشانہ ایسا پکا ہے کہ جس کو غلیل ماروں وہ بچ ہی نہیں سکتا ۔ میں اڑتے ہوئے پرندے کا بھی نشانہ لگا سکتا ہوں۔''

'' تو چلیں بندر کو غلیل ماریں۔'' ایک لڑکے نے کہا۔'' وہ دیکھو ! بندر شاخ پر بیٹھا ہے۔''

'' ہاں دیکھیں! کس کا نشانہ صحیح بیٹھتا ہے؟'' ایک دوسرے لڑکے نے کہا۔

اُن لڑکوں کی باتیں چیں چو نے بھی سنا اور توتو نے بھی ۔ توتو بولا:'' چیں چو! تم یہیں رہو۔ میں اِن لڑکوں کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں۔ یہ جیسے ہی غلیل چلانے جائیں گے۔ میں اتنی زور سے بھونکوں گا کہ یہ ڈر کر بھاگ جائیں گے۔ اپنی بھوں بھوں سے میں انھیں ایسا ڈراؤں گا کہ پھر کبھی بھی وہ ادھر آنے کی ہمت نہیں کریں گے۔''

'' ٹھیک ہے، لیکن میں بھی آتی ہوں ۔ تم جا کر اُن لڑکوں کو ڈراؤ۔'' چیں چو نے کہا۔

لڑکے جلدی سے درخت کے پاس پہنچے ۔ ایک لڑکے نے کہا :''دیکھومیرا نشانہ کتنا صحیح ہے میں غلیل چلاؤں گا تو میرا ڈھیلا سیدھا بندر کے سر پر لگے گا۔ ''

توتو کے قریب آکر چیں چو بھی کھڑی ہوگئی۔ پھدکو بندر درخت پر سے دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکا اس کو غلیل مارنے والاہے۔ اُس نے سوچ لیا کہ جیسے ہی وہ لڑکا غلیل چلائے گاوہ چھلانگ لگاکر دوسری شاخ پر چلا جائے گا۔

لڑکے نے جیسے ہی غلیل سے نشانہ لگایا ۔ توتو نے ایسی زور سے بھوں بھوں بھونکا کہ وہ بُری طرح ڈر گئے اور غلیل وہیں پھینک کر نو دو گیارہ ہوگئے۔ پھدکو نے دیکھا کہ لڑکے ڈر کر وہاں سے بھاگ گئے اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ ان کو توتو نے ڈراکر بھگایا ہے۔

اب پھدکو بڑا شرمندہ ہوا۔ کہیں ڈھیلا اسے لگ جاتا تو؟ توتو نے شرارتی لڑکوں کو بھگا کر اُس پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

پھدکو شاخ سے کود کر نیچے آیا اور توتو سے بولا:'' بھیا! مجھے معاف کردینا ۔''

''کس بات کے لیے ؟'' توتو نے انجان بن کر پوچھا ۔ '' کیا چیں چو دیدی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟'' پھدکو نے کہا۔

'' نہیں مجھے تو کچھ نہیں معلوم ۔'' توتو بولااور چیں چو سے پوچھا:'' کیا بات ہے چیں چو؟''

'' کچھ نہیں کوئی بات نہیں ہے ۔'' چیں چو بولی۔ وہ توتو کو کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ کہیں پھدکو اور توتو میں دراڑ پڑ جائے۔

اب پھدکو خود ہی بولا :'' میں نے ایک دن چیں چو سے کہا تھا کہ توتو تمہیں کسی دن دھوکا دے گا ، اُس کا ساتھ چھوڑ دو۔''

توتو ہنسا :'' بس اتنی سی بات ، اس کے لیے معافی مت مانگو ۔ تمہارے دل میں شک تھاسو وہ آج دور ہوگیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

توتوکتے نے پھدکو بندر کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ پھدکو بندر کا ہاتھ چیں چو بلی نے پکڑ لیا اور تینوں کہتے جارہے تھے ہم تینوں دوست ہیں۔

§§§

سیدھا راستہ

مصنف: حاجی بصیر سراج

فیضان بہت پیا را بچہ تھا اپنے امی ابو کا راج دُلارا تھا فیضان کے ابو محنت مزدوری کرکے فیضان کو تعلیم دلوارہے تھے فیضان کی امی بھی فیضان کا بہت خیال رکھتی تھیں ،غربت کے باوجود والدین فیضان کی ہرخوشی کاخیال رکھتے تھے ،اچھا کھانا پینا تعلیم اچھا لباس کھیل کود سیر و تفریح غرض یہ کے فیضان کو ہر چیزٹائم پہ مہیاہوتی تھی بعض دفعہ تو والدین خود بھوکے سو جاتے مگر فیضان کو کسی قسم کی تنگی نہیں آنے دیتے تھے فیضانپانچویں کلاس میں ہوا تو فیضان کی امی نے فیضان کی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنی شادی کی واحدنشانی سونے کی انگوٹھی بیچ کر فیضان کو سائیکل لے دی فیضان بہت خوش ہو ا کہ اسے سائیکل مل گئی ہے اب فیضان کو پیدل اسکول نہیں جانا پڑتا تھا ، فیضان پڑھائی میں بہت اچھا تھا ہمیشہ فرسٹ پوزیشن لیتاتھاسب کچھ ٹھیک چل رہا تھا،جب فیضان آٹھویں کلاس میں ہوا تو ایک امیر باپ کے ضدی بیٹے وِکی سے فیضان کی دوستی ہوگئی وِکی بہت ضدی اور پڑھائی میں نکمہ تھا وکی اپنی موٹر سائیکل پر سکول آتا تھا اورفیضان کی پرانی سائیکل دیکھ کر بہت ہنستا تھا اور فیضان کا مذاق اڑاتاتھا ،اساتذہ فیضان سے بہت خوش تھے اور وکی ہمیشہ اساتذہ سے ڈانٹ کھاتا تھا وکی فیضان کو اکثر الٹی سیدھی باتیں کر کے اُکسانے لگا ایک دن وکی نے فیضان سے کہاتم بھی موٹر سائیکل لے لو پرانی سائیکل کی جان چھوڑ دو،پہلے تو فیضان نے وکی کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا مگر وکی نے بھی ٹھان رکھی تھی کہ فیضان کو پڑھائی میں خود سے آگے نہیں جانے دے گا ،اور اپنی طرح نکمہ کرے گا تاکہ اساتذہ فیضان کی قدر نہ کریں۔

آخر کار وکی اپنے ارادے میں کامیاب ہونے لگا،فیضان ہر روز والدین سے موٹرسائیکل کی ضدکرنے لگا فیضان کے والدین کے پاس اتنے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے فیضان کے والدین پریشان رہنے لگے تھے،فیضان کے سالانہ امتحان نزدیک تھے اور فیضان نے اپنی ضد میں پڑھائی پرتوجہ بھی کم کر رکھی تھی،والدین نے فیضان کو بہت سمجھایا کہ پڑھ لکھ کر جب بڑے آدمی بنو گے تو ہر چیز تمھیں آسانی سے مل سکے گی یہ وقت بہت قیمتی ہے اسے ہاتھ سے مت گنواؤ مگر فیضان وکی کی وہی باتیں دوہراتاکہ آپ مجھے پیار نہیں کرتے ورنہ مجھے وکی کے ابو کی طرح ہر قیمتی چیز لے کر دیتے،وکی ٹھیک کہتا ہے آپ مجھے اپنی خاطر پڑھا رہے ہیں تاکہ میں بڑھاپے میں آپ کو پیسے کما کے لا کر دیا کروں فیضان کے والدین جب ہر طرح سے فیضان کو سمجھا کرتھک گے تو انھوں نے اپنے چھوٹے سے گھر کا آدھا حصہ بیچ کر فیضان کی ضد پوری کرنے کا فیصلہ کرلیا وکی کے سارے ارادوں کی خبر فیضان کے بہت اچھے دوست آصف کو ہوگئی اور آصف نے فیضان کو ساری بات سے اگاہ کیا فیضان ساری بات سن کر حیران پریشان اور کشمکش کے عالم میں اسکول سے چھٹی کے وقت گھر جا رہا تھاکہ فیضان کی سائیکل راستے میں ایک پتھر سے ٹکرا گئی پاس ہی ایک بزرگ جو کہ بھیک مانگ رہا تھا اس نے فیضان کو زمین سے اٹھنے میں مدد دی ،اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر فیضان سے بزرگ نے پوچھا بیٹا کیسے گر گئے؟ فیضان کو معمولی خراش آئی تھی فیضان بڑبڑانے لگا اگر والدین میری بات مان لیتے موٹر سائیکل لے دیتے تو میں پرانی سائیکل سے نہ گرتا ،

بزرگ نے کہا شکر ادا کرو کہ! یہ سائیکل کی وجہ سے معمولی چوٹ آئی ہے موٹر سائیکل کی چوٹ بہت بری ہوتی ہے یہ دیکھو بیٹا میرا ایک بازو موٹرسائیکل سے گرنے سے ہی ضائع ہوا تھا فیضان نے جب بزرگ کا ایک بازو کٹا ہوا دیکھا تو بہت خوف زدہ ہوا اور بزرگ سے پوچھنے لگا یہ کب اور کیسے ہوا بابا جی؟بزرگ نے بتایا:بیٹا میں تمھاری عمر کا تھا اور یہ میری اپنی ضد اور نا فرمانی کی وجہ سے ہوا ،ورنہ شاید آج میں بھکاری نہیں ہوتا پڑھا لکھا افسر ہوتا میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا میرے والد مجھے اپنی طرح افسر بنانا چاہتے تھے مگر میں نے بری صحبت میں پڑ کر والدین کی محبت کو فراموش کر دیا تھا ان کے خلوص سے دیے ہوئے سائیکل کو ٹھکرا کر موٹر سائیکل کی ضد تو پوری کروا لی تھی مگر اس کا نتیجہ اب تک بھگت رہا ہوں میری موٹر سائیکل کے آگے پتھر ہی آیا تھا جسے میں دیکھ نہیں سکا تھا اور بری طرح سڑک پر جا گرا تھا میرے بازو کو ایک تیز رفتار گاڑی کچل گئی تھی میری ماں میرے ایکسیڈنٹ کی خبر برداشت نہ کر سکی اور اللہ کو پیاری ہوگئی میرے والد میری دیکھ بھال کی وجہ سے افس نہیں جا سکتے تھے میرے والد نے ہر ممکن کوشش کی کہ میرا بہتر علاج ہو سکے مگر ایسا ممکن نہ ہو سکا میرے والد صدمے سے بیمار رہنے لگے اور ذ ہنی مریض ہوگئے والد کی جمع پونجی سب ختم ہوگئی اور ایک دن والد بھی مجھے چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے۔میں آج بھی پچھتاتا ہوں کاش اپنے والدین کی نا فرمانی نہ کرتا، بیٹا دو باتیں ہمیشہ یاد رکھنا۔

(۱)انسان جتنی زیادہ بلندی سے نیچے گرتا ہے چوٹ اتنی ہی زیادہ گہری آتی ہے۔

(۲)کچھ لوگ راستے میں پڑے ہوئے پتھروں کی طرح ہوتے ہیں جوہماری زندگی میں آتے ہیں جنہیں ہم بروقت پہچان کر ٹھوکر سے نہ بچ سکیں تو ہمیں بہت گہری چوٹیں لگ سکتی ہیں جو ہماری ساری زندگی تباہ و برباد کر سکتی ہیں،اور ہماری زندگی میں کچھ لوگ ٹریفک کے اشاروں کی طرح بھی ملتے ہیں جو ہمیں راستہ بتاتے ہیں مگر والدین ہمارے لیے ایک چراغ کی مانندہوتے ہیں جو ہر سیدھا راستہ کی طرف روشنی دیکھاتے ہیں بس ہمیں اگر زندگی کا سفر آسانی سے طے کرنا ہے تو اپنے والدین کی فرمانبرداری کرنی چاہیے۔بزرگ کی باتیں سن کر فیضان بہت پشیمان ہو ا اورفیضان کو احساس ہوا کہ جانے انجانے میں وہ بہت بڑی غلطی کرنے جا رہا تھا فیضان کے لیے بزرگ فرشتہ بن کر آیا تھا جس سے فیضان کو ایک پل میں پوری زندگی بہتر بنانے کا سبق ملا تھا ،فیضان کے دل پربزرگ کی باتوں کا بہت اثر ہوا فیضان نے بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور فوراً گھر جا کر اپنے والدین سے معافی مانگی اور آئندہ کبھی ضد نہ کرنے اور دل لگا کر پڑھائی کرنے کا وعدہ کیا فیضان کے والدین بہت خوش ہوئے اور اللہ کا شکر ادا کیا ،فیضان نے خود سے عہد کیا کہ وہ خود بھی پڑھے گا اور وکی کو بھی سیدھے راستے پر لانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا،فیضان کی محنت رنگ لائی آٹھویں کلاس میں فیضان نے فرسٹ اور وکی نے دوسری پوزیشن حاصل کی دونوں دوست بہت خوش ہوئے سب اساتذہ نے فیضان اور وکی کوشاباش دی۔ختم شدہ

§§§